متاع آخر شب
محسن زیدی

پیش کردہ:۔ —— رفیعہ زیدی

متاعِ آخرِ شب

محسن زیدی

یہ کتاب اُردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

انتخاب :- مخمور سعیدی ترتیب: راج نرائن راز

تعاون واشتراک :- حیات لکھنوی، پروانہ ردولوی

خوشنویس :- سید خورشید انور پھلواروی

سرِ ورق :- رزّاق ارشد

ماہ وسالِ اشاعت :- فروری ۱۹۹۰ء

تعداد :- چھ سو

طباعت :- مرکزی پریس، گلی قاسم جان، دہلی ۱۱۰۰۰۶

قیمت :- چالیس روپے

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، علی گڑھ، بمبئی

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) اُردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

آزاد کتاب گھر، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ

امّاں کے نام

ایک طائرِ دشتِ جاں کے پاس ہی اُڑتا رہا
سر پہ جب بھی دُھوپ آئی اُس نے سایا کر دیا

بے شجر راستوں کا زادِ سفر

آزادی کے بعد جس طرح زندگی کے دوسرے سبھی شعبوں میں اُتھل پتھل ہوئی اسی طرح ہمارے شعری اور ادبی میلانات میں بھی ایسی تبدیلیاں رُونما ہوئیں جو دُور رس اثرات کی حامل تھیں۔ ترقی پسندوں کے یہاں کلاسیکل روایات سے انحراف اور گریز کی جو صورتیں سامنے آئی تھیں ان کی نوعیت زیادہ تر نظریاتی تھی۔ انھوں نے ادب کے جمالیاتی فیضان سے زیادہ اس کی سماجی افادیت پر زور دیا لیکن آزادی کے بعد جب ترقی پسندی کا طلسم بکھرا اور جدیدیت کے رجحان نے فروغ پایا تو اس سے اثر پذیر ہونے والے اکثر ادیبوں اور شاعروں نے زبان و بیان کے بنے بنائے سانچوں کی جو توڑ پھوڑ کی وہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ ترقی پسندوں کے بارے میں یہ تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ زبان و بیان کے تقاضوں سے بے پروائی برتتے ہیں اور ہماری ادبی اور فنی روایت کے مزاج شناس نہیں ہیں لیکن ان میں ایسا کوئی ادیب یا شاعر مشکل ہی سے شامل رہا ہوگا جس نے مسلّمہ فنی معیاروں سے دانستہ انحراف کیا ہو۔ ان کی بیشتر ترجیحات موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں یعنی انھوں نے فکر و فن کی داخلی دنیا کو بدلنے کی کوشش کی تھی، اس کے خارجی نظام کی شکست و ریخت سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔

لیکن جدید شاعروں کا احساس یہ تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ اظہار و اسلوب کے مروّجہ سانچوں میں نہیں سما سکتا نہ مروّجہ لفظیات اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔ ان کے اس احساس کو حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا، بالخصوص ان کے سربراہ میراجی کے فکر و عمل کی پشت پناہی حاصل تھی جنھوں نے موضوعات کی توسیع کے ساتھ ساتھ لفظیات

میں ایک انقلاب لانے کی بھی شعوری کوششیں کی تھیں۔ میراجی نے غیر شاعرانہ زبان کو جس طرح شعری ذریعۂ اظہار کے طور پر کارآمد بنانا چاہا تھا اس نے اکثر نئے شاعروں کو اس راہ پر چلنے کی ترغیب دی اور انھوں نے شعری اور غیر شعری زبان کی حد بندیاں توڑ دیں۔

نئے شعرا کے اس رویے کو محض حلقۂ ارباب ذوق کے شعرا کی تقلید سے موسوم کرنا درست نہ ہوگا۔ ان شعرا نے جن پُر آشوب حالات میں شعور کی آنکھیں کھولی تھیں۔ عدم استحکام اور عدم تحفظ کی جس فضا سے وہ دوچار تھے اور بے یقینی و بے اعتمادی کی جو شہزور لہریں ان کے ذہنی ساحلوں سے آ کر ٹکرا رہی تھیں، ان کے قدم اپنی زمین سے جس طرح اکھڑ رہے تھے اور اس صورت حال کے نتیجے میں وہ جس بے اطمینانی و بے چینی میں گھر گئے تھے، اس نے اُن کے لیے ہر پرانی وراثت کو مُشتبہ بھی کر دیا تھا اور بے معنی بھی۔ ظاہر ہے ہماری شعری اور فنی روایت بھی اسی وراثت کا ایک حصّہ تھی اور اسی لیے انھوں نے اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا۔

محسنؔ زیدی کی شاعری پر گفتگو کرنے سے پہلے میں نے یہ قدرے طویل تمہید اس لیے باندھی کہ محسنؔ زیدی بھی شاعروں کی اسی پیڑھی سے تعلّق رکھتے ہیں جو آزادی کے بعد سامنے آئی۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ کشت و خوں کے کچھ مناظر خود اُن کے بقول انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے بعد اُن کے گرد و پیش کی دنیا بھی وہی رہی ہے جس سے ان کے ہم عصر دوسرے شاعروں کا سابقہ پڑا لیکن محسنؔ زیدی کے کلام کے مطالعے سے ہم بہ آسانی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ عصری صورتِ حال کی المناکیوں، دہشت انگیزیوں اور ہلاکت آفرینیوں سے براہ راست باخبری اور انسانی فکر و عمل کے ہر شعبے پر ان کی بھرپور گرفت کے حوصلہ شکن احساس کے باوجود وہ ان کے سامنے سپر انداز ہونے کو تیار نہیں ہیں اور انھیں انسان دشمن طاقتوں پر بالآخر انسان کی فتحیابی کا یقین ہے۔

ان کا یہ غیر متزلزل یقین جس نے زمین اور آسمان کی بنیادیں ہلا دینے والے قیامت

آثار زلزلوں میں بھی ان کے داخلی وجود کو اس طرح ٹوٹنے بکھرنے نہ دیا کہ منتشر اجزا، کو سمیٹ سکنا ممکن نہ رہے، آخر اس یقین کی جڑیں کہاں پیوست ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان جڑوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ بالخصوص کربلا کے واقعات اور ان کے اخلاقی مضمرات تک رسائی پالینا کافی ہے۔ ثبات واستقلال کی وہ عظیم الشان وراثت جو انتہائی صبر آزما حالات میں بھی اپنے وارثوں کو خود اعتباری اور خود اعتمادی کی دولت سے تہی دست نہیں ہونے دے سکتی، محسنؔ زیدی سیّد زادے ہیں اور اس وراثت کے سچّے امین۔

محسنؔ زیدی کے دوسرے شعری مجموعے "رشتۂ کلام" پر جو ۱۹۷۰ء میں منظرِ عام پر آیا تھا، مَیں نے اپنے تاثّرات ان لفظوں میں پیش کیے تھے۔

"واقعۂ کربلا جو اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا خونیں حادثہ ہے اور جس کی کوئی دوسری مثال شاید پوری انسانی تاریخ میں بھی مشکل ہی سے ملے گی، کچھ گروہی معتقدات کی دُھند میں اس طرح لپٹا کہ اس کی ہمہ گیر معنویت بڑی حد تک آنکھوں سے اوجھل ہوگئی ——— اردو میں زیادہ تر مرثیہ گو شاعروں ہی نے اس واقعے کو اپنا موضوعِ سخن ٹھہرایا لیکن یہ مرثیے بالعموم بیانِ واقعہ سے آگے نہیں بڑھے اور چونکہ یہ عزائی مجلسوں کے لیے لکھے گئے تھے اس لیے شاعروں کا مطمحِ نظر رقّت آفرینی رہا، تفکّر کا عنصر اُن میں برائے نام ہے محسنؔ زیدی کی غزلیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں انھیں پڑھتے ہوئے مَیں نے محسوس کیا کہ ان کا سب سے نمایاں وصف وہ فکری پس منظر ہے جس کی تشکیل میں یہ سانحہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ سانحہ اپنے اندر جو اخلاقی مضمرات رکھتا ہے اور جن کی نوعیت آفاقی ہے، ان کا ایسا وجدانی عرفان اور ایسا شعری اظہار، جیسا محسنؔ صاحب کے اشعار میں ملتا ہے،

غزلیہ شاعری میں اس کی کوئی اور مثال، اپنے محدود مطالعے کی حد تک مجھے نظر نہیں آتی۔ ان اشعار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ عصری صورتِ حال پر بھی اپنا عکس ڈالتے ہیں یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ عصری آگہی بھی خود ان میں منعکس کرتی ہے۔ ماضی کی ایسی بازیافت جو حال کے آئینوں کو روشن کر دے، ایک گہرے ذہنی اور جذباتی عمل سے گزرے بغیر ممکن نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ محسن زیدی بھی اس عمل سے گزرے ہیں اور کامیابی کے ساتھ گزرے ہیں۔"

"رشتۂ کلام" پر جو تبصرے ہوئے، ان میں سے بعض میں میرے ان تاثرات کو بھی زیرِ بحث لایا گیا اور کہا گیا کہ میں نے ہوا میں گرہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ محسن زیدی غزل گو شاعر ہیں اور غزلیہ شاعری کو واقعاتِ کربلا سے کیا سروکار، یہ تو صرف مرثیے کے موضوع بنے ہیں اور بن سکتے ہیں۔ یہ مرثیے کے لیے ہیں اور مرثیہ ان کے لیے ——— لیکن مجھے کہنے کی اجازت دی جائے کہ میرے اس حقیر خیال نے آگے چل کر کچھ نامور ناقدین کو اس طرح اپنی طرف متوجہ کیا کہ انھوں نے پوری اُردو شاعری میں واقعاتِ کربلا اور ان کے اخلاقی مضمرات کے انعکاس کو اپنی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا موضوع بنایا اور طول طویل مقالے لکھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن ناقدین کو یہ اثرات محسن زیدی سے زیادہ کچھ دوسرے ہمعصر شعرا کے یہاں نظر آئے۔ لیکن غور کیا جائے تو ان شعرا کے یہاں واقعاتِ کربلا کا گزر محض ایک تلمیح کے طور پر ہوا ہے، ایک ایسی تلمیح جو مختلف موقعوں پر مختلف انداز میں بار بار دُہرائی گئی ہے اور فوری اپیل کی حامل ہے۔ محسن زیدی کے پورے شعری کردار کا خمیر ہی ان عناصر سے اٹھا ہے۔ یہ عناصر کیا ہیں؟ غیرتِ نفس، خود اعتمادی، راسخ العقیدگی، اپنے محسوسات اور مشاہدات پر بھروسا، کردار کی استقامت، جابر طاقتوں کے سامنے خواہ وہ زمانی ہوں یا مکانی سپر انداز نہ ہونے کا حوصلہ، مکافاتِ عمل پر یقین، انسانی سرشت میں نیکی کی تلاش اور سچائی کی ظفر مندی پر ایمان۔ ساتھ ہی ساتھ آنے والی نسلوں کی خیر خواہی

اور ان کی بھلائی کی خاطر بے دریغ قربانی کا جذبہ۔ یہ وہ جذباتی اور ذہنی پس منظر ہے جس سے محسن زیدی کی پوری شاعری کا منظر نامہ متشکل ہوتا ہے۔ یہ پس منظر محسن زیدی نے شعوری طور پر تیار نہیں کیا ہے۔ یہ ان کے تاریخی لاشعور کا پرتو ہے جو ان کی شاعری پر پڑ رہا ہے۔ تصوف کے لیے کبھی کہا گیا تھا کہ برائے شعر گفتن خوب ست، مراد یہ تھی کہ اگر تصوف شاعر کے مزاج میں رچا بسا نہیں ہے تو بھی متصوفانہ خیالات کی آمیزش سے شعر میں کچھ آب و رنگ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ماضی قریب میں تصوف کی جگہ یہ حیثیت سیاست کو دے دی گئی تھی اور اب کچھ تاریخی اور مذہبی تلمیحات ہیں جن سے یہ کام لیا جانے لگا ہے —— افتخار عارف کے استثنا کے ساتھ، واقعاتِ کربلا سے ہمارے زمانے کے کئی مشہور شعرا کا شغف بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ محسن زیدی کے یہاں واقعاتِ کربلا کی نوعیت پہلی نظر میں سامنے آجانے والے حوالے کی نہیں جو حاشیے میں نمایاں طور پر درج کر دیا گیا ہو، ان کی شاعری کی کتاب کا یہ وہ مضمون ہے جسے سطور ہی میں نہیں، بین السطور بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

اب محسن زیدی کے کچھ شعر دیکھیے اور میری معروضات کی صحت یا عدمِ صحت پر غور کیجیے۔

ہے معرکۂ کرب و بلا اصل میں دنیا
بازیچۂ اطفال کو دنیا نہیں کہتے

ہے شکست و فتح نصیب سے مجھے ہار جانے کا غم نہیں
ہیں عذابِ جاں سے تو بچ گیا مری عاقبت تو سنور گئی
کسی بارگاہِ نیاز میں گئی خالی ہاتھ نہ زندگی
کبھی لے کے نقدِ ہنر گئی کبھی لے کے ہدیۂ سر گئی

طے ہم نے بھی کر رکھا ہے مانگیں گے نہ اس سے
یہ سچ ہے اگر قبلۂ حاجات وہی ہے

کیسۂ زر سے سبھی بولتے منہ بند ہوئے
اب کسی منہ سے بھی حق بات نکلنے سے رہی
وہ زمیں بوئے گئے دشنہ و خنجر جس میں
وہ کوئی لعل و جواہر تو اُگلنے سے رہی
آئیں گے ہم بناتے ہوئے اپنے نقش پا
چل کر کسی کے نقشِ قدم پر نہ آئیں گے

دشمن کو بھی ہم نے کبھی دشمن نہیں سمجھا
ہم جاں سے گئے اپنی وسیع النظری میں

تم میں سے جو بھی چاہے مرا ساتھ چھوڑ دے
دیکھو یہاں سے راستے دشوار آئیں گے

نام اس دشت کا پیاسوں کے لہو سے چمکا
اس بیاباں کو یہ شہرت کبھی پہلے تو نہ تھی

جو ریگ زیرِ قدم آئی بن گئی سبزہ
غبار سر پہ جو آیا تو شامیانہ ہوا

بہلا کے لے گیا سچائیوں کو جھوٹ کے ساتھ
کہ اُس کے پاس تھے طبل و علم بھی لشکر بھی

کرنے دو آج اس کو قلم روشنی کا سر
دیکھو وہ کل جو ہاتھ نہ ملتا دکھائی دے

کون اُس دشت میں کہتا مجھے محسنؔ لبیک
اپنی ہی خاکِ نوا گونج کے لوٹ آئی تھی

مشعلیں سر کی سجائی گئیں طشتِ زر میں
کب سے مقتل میں چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا
سفرِ جاں کی ہوئی اب کہیں جا کر تکمیل
یعنی مَیں بے سروساماں نہ ہوا تھا سو ہوا

قاتل کے ہاتھ میں جو یہ نیزا بلند ہے
اس سے وہ سر بہت ہی زیادا بلند ہے
دریا جہاں رواں ہے اسی کے نشیب میں
اب تک کسی جری کا پھریرا بلند ہے

ناگاہ تو اس دشت میں آئے نہ تھے محسنؔ
معلوم تھا سر پر کہیں سایا نہیں ہوگا

مجھ کو دیکھو کہ لڑا مَیں تنِ تنہا کیسے
اس کی نصُرت کو تو کُل نوعِ بشر ساتھ رہی

جنگ پانی کے لیے دریا بہ دریا آج بھی
معرکہ صحرا بہ صحرا میرے اُس کے درمیاں
منحصر ہے میرے سر پر اس کے خنجر پر نہیں
یہ سر و خنجر کا رشتا میرے اُس کے درمیاں

اِن اشعار کے انتخاب میں مجھے کوئی کاوش نہیں کرنی پڑی ہے' یہ جن احساسات وخیالات کے حامل ہیں وہ محسن زیدی کی شاعری میں قدم قدم پر اپنی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ محسن زیدی کسی ایک وادی کے سیاح ہوں' حیات وکائنات اوران کے وہ معاملات ومسائل جن کا سامنا ہر ذی ہوش انسان کو کرنا پڑتا ہے' محسن زیدی انھیں ایک مخصوص نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ نظر اس روایت کی پروردہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا لیکن محسن زیدی کے مشاہدات کا علاقہ خاصا پھیلا ہوا ہے۔ معاشی تفریق' معاشرتی اونچ نیچ سماجی مدارج کے زینے پر اوپر نیچے کھڑے افراد کے تحفظات وتعصبات اوران کی پیدا کردہ ذہنی اور جذباتی ناہمواریاں ــ نفرتیں اور منافقتیں' افتراق اور نفاق' شر اور فساد۔ پھر دل کے معاملات جو دنیا کی نظر میں کچھ زیادہ قدر وقیمت کے حامل نہ سہی صاحبانِ معاملہ کو جی جان سے عزیز ہیں اور اس میں حُسن وعشق کے روابط ہی نہیں' خلوص ومحبت پر مبنی دوستانہ رشتے بھی شامل ہیں۔ دوستی کے رشتے کا محسن زیدی کے دل میں کتنا احترام ہے اس کا کچھ اندازہ ان کے اس طرح کے اشعار سے کیا جاسکتا ہے:

احباب کیوں تلاش کریں اور کوئی در
اُن کے لیے تو وا ہے یہ دل وہ اِدھر سے آئیں

یہ بزمِ دوستاں ہے چلے آؤ بے جھجک
کوئی یہاں نہ پست نہ ایسا بلند ہے

مُحب اور محبوب کو محسنؔ زیدی ایک ہی تصویر کے دو رُخ خیال کرتے ہیں اور محبوب کی صفت میں انھیں اپنی ہی ذات کا پرتو نظر آتا ہے:

وہ جو خواب خواب تھی ذہن میں، تھی جو عکس عکس نگاہ میں
وہی شکل آنکھ میں کھُب گئی وہی شکل دل میں اُتر گئی

کچھ میرے ہی مانند ہے طرزِ سخن اس کا
اندازِ اشارات و کنایات وہی ہے
دونوں ہی طرف آگ برابر کی ہے محسنؔ
دونوں ہی طرف گرمیِ جذبات وہی ہے

معدوم ہوئے جب ہم رہتا وہ نمایاں کیا
پہچان جو تھی اپنی اس کی بھی نشانی تھی

دُوریوں میں بھی وہ قربتوں کے امکان سے دست کش نہیں ہوتے:

حصارِ جاں کے وہ اس پار ہی تو رہتا ہے
فقط ہے شرطِ سفر فاصلہ بھی کوئی نہیں

جُدائی اگر مقدر ٹھہرے تو بچھڑ جانے والے پر کوئی الزام کیوں رکھا جائے:

اب اس ترکِ تعلّق کو مقدر ہی سمجھ لیجے
ہمیں تسلیم ہے اس کا بھی منشا یہ نہیں ہوگا

زبان و بیان کے معاملے میں بھی محسنؔ زیدی بدعت زدگی سے دُور ہیں، فنّی

رکھ رکھاؤ کی وہ مستحکم روایت جو ہمارے اساتذہ سے ہم تک پہنچی ہے، وہ نہ اسے کلّیتہً رد کرتے ہیں نہ اس سے کسی قسم کا انحراف روا رکھتے ہیں۔ انھوں نے مروّج اور معتبر شعری لفظیات کے دائرے سے نکل کر نہیں اس دائرے میں رہ کر ہی اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے لہجے کی تازگی لفظوں کے نئے پن کی نہیں، ان واردات کی مرہونِ منّت ہے جو نجی اور شخصی ہیں اور عصری زندگی کی دین ہیں۔ پرانے اسالیب اور پرانے الفاظ کو نیا آہنگ اور نئی معنویت دینے کی ایک کامیاب کوشش ماضی قریب میں ہمیں فیض کے یہاں ملتی ہے لیکن فیض کہیں کہیں صحتِ زبان و بیان کے تقاضوں کو نظر انداز بھی کر جاتے ہیں۔ محسن زیدی اس معاملے میں بہت محتاط ہیں لیکن ان کی یہ احتیاط کبھی کبھی انھیں اس مقام تک بھی لے جاتی ہے جہاں ان کے اشعار لفظی دروبست کا اچھا نمونہ ہوتے ہوئے بھی فکر و خیال کی تازگی سے کچھ دُور جا پڑتے ہیں۔

محسن زیدی کا اسلوبِ سخن سجیلا نہیں سادہ ہے اور سادگی میں تاثر آفرینی ان کا خاص ہُنر ہے۔ یہ ہُنر آسان نہیں مگر محسن زیدی اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں۔

دہلی

۲۷ دسمبر ۱۹۸۹ء

مخمور سعیدی

باسمہ

مَیں ایک حرف، معانی کا ایک دفتر وہ
مَیں ایک موجِ سرِآب جو، سمندر وہ

تمام ثابت و سیّار اُس کے حلقہ بگوش
یہ کائنات ہے اِک دائرہ تو محور وہ

تمام مملکتیں اُس کے ہی قلم رَو ہیں
سب اُس کے زیرِ نگیں بحر و بر کا داور وہ

سروں پہ اہلِ کرم کے ہے ابرِ رحمت کا
ستم گروں کے لیے قہر کا ہے لشکر وہ

کہیں ہے دن کی تپش میں شجر شجر سایہ
کہیں ہے شب کے اندھیرے میں ماہ و اختر وہ

کوئی مدد کو نہ آئے گا ایسی منزل ہے
پناہِ جاں کو ملے گی اگر ہے رہبر وہ

پھر اُس کی حمد و ثنا کس طرح لکھی جائے
حدودِ لفظ و معانی سے جب ہے باہر وہ

کتابِ دین کی تکمیل ہو چکی محسن
زمیں پہ بھیج چکا آخری پیمبر وہ

مرے سخن نے مجھے روشناس سب سے کیا
وگرنہ چہرے سے پہچانتا بھی کوئی نہیں

جہاں پہ قبضہ قریب و بعید اُس کا ہے
کوئی بھی ملک سہی زر خرید اُس کا ہے

جسے بھی سُنیئے اُسی کا ہے نام وردِ زباں
جسے بھی دیکھئے مشتاقِ دید اُس کا ہے

ملی ہے عالمِ امکاں سے خاک مُٹھی بھر
بس اتنا میرا ہے جو ہے مزید اُس کا ہے

میں کیا کروں جو مری بات وہ نہیں سنتا
کہ نُطق میرا ہے گوشِ شنید اُس کا ہے

کہاں کے ہم ہیں مصوّر کہاں کے صورت گر
یہ سحرِ حسن یہ افسونِ دید اُس کا ہے

کِھلے گی ہاتھوں پہ اُس کے مرے لہو کی حنا
کہ روزِ قتل مِرا روزِ عید اُس کا ہے

مری کہانی تو اِس موڑ پر تمام ہوئی
کہ اب جو قصّہ ہے اِس سے بعید اُس کا ہے

مرا کلام بھی محسنؔ اُسی سے ہے منسوب
کہ سب کلامِ قدیم و جدید اُس کا ہے

یہ سُخن جو میری زباں پہ ہے یہ سُخن ہے اُس کا کہا ہوا
یہ بیاں جو ہے مرے نام سے یہ بیاں ہے اُس کا لکھا ہوا

وہی مَیلی مَیلی سی چاندنی وہی دُھندلی دُھندلی سی روشنی
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجُھا ہوا

وہی ایک یاد کرن کرن مری زندگی میں ہے ضو فگن
وہی ایک چہرہ چمن چمن سرِ دشتِ جاں ہے کِھلا ہوا

سرِ راہ کچھ نہ پتا چلا وہ کہاں گیا وہ کدھر گیا
کہیں نقشِ پا تھا بنا ہوا کہیں نقشِ پا تھا مٹا ہوا

کروں دوستوں کو میں نذر کیا مرے پاس دام و درم کہاں
وہ جو دشمنوں کا حساب تھا وہ تو نقدِ جاں سے ادا ہوا

نہ کسی کی یاد کا نقش ہے نہ کسی کے رُخ کا یہ عکس ہے
یہ نہ کوئی حرف نہ لفظ ہے سرِ خاک کیا ہے لکھا ہوا

مجھے محسن اِس کا گلہ نہیں مجھے مال و زر جو مِلا نہیں
جو ہُنر سُخن کا مجھے مِلا وہ کہاں سبھی کو عطا ہوا

○

بس کہ دشوار ہے اُس شخص کا چہرا لکھنا
ورنہ مشکل تو نہیں کوئی سراپا لکھنا

یہ بھی ممکن ہے کہ تحریر بدل دی جائے
دوستو اپنا بیاں خون سے پختا لکھنا

کچھ ہمیں سیر و تماشہ سے نہیں دلچسپی
شغل بس اپنا ہے تنہائی میں پڑھنا لکھنا

دل کا دروازہ تمہارے لیے وا رکھیں گے
لَوٹ آنے کا کبھی ہو جو ارادا، لکھنا

بھیج تو سکتے ہو تم لکھ کے شکایت اُن کو
شرط بس یہ ہے کوئی لفظ نہ چُبھتا لکھنا

لوگ اسناد کے کشکول لیے پھرتے ہیں
کتنا بے سُود ہے اِس دور میں پڑھنا لکھنا

ایسے دیوانے ہیں لکھتے ہوئے تھکتے ہی نہیں
ایک ہی لفظ کو سیدھا کبھی اُلٹا لکھنا

پاسِ تہذیب تو کچھ پاسِ قلم ہے ہم کو
ورنہ آتا ہے ہمیں جیسے کو تیسا لکھنا

لوگ جب لکھ کے سیہ کر گئے دیواریں تک
کون پڑھتا ہے بھلا ریت پہ میرا لکھنا

سر میں سودا تھا عجب لکھ گیا اس کو کیا کچھ
دل نے سمجھایا بہت تھا کہ نہ ایسا لکھنا

یاد کیا رکھتا کہ وہ زود فراموش بھی تھا
مَیں بھی کچھ بھول گیا اُس کو تقاضا لکھنا

لکھتے ہی جائیں گے ہم اُن کو عریضے محسن
وہ پڑھیں یا نہ پڑھیں کام ہے اپنا لکھنا

○

مرے قلم نے نہ باطل کا تذکرہ لکھا
مآل کچھ بھی ہوا حرفِ حق سدا لکھا

وہ اک فریب تھا سجدہ جسے کہا اُس نے
وہ ایک عرضِ غرض تھی جسے دعا لکھا

عجب ہے اُس کی سیاست لکھا جبیں پہ کبھی
کبھی مٹا کے وہی نام زیرِ پا لکھا

پڑھا تو ایک ہی انداز سے پڑھا لیکن
اُسے لکھا تو سبھی نے جُدا جُدا لکھا

دلوں کے باب میں لفظِ جفا لکھا ہوتا
وہ ایک حرفِ غلط تھا جسے وفا لکھا

وہ حرف حرف تو محسن ہے میری ہی تحریر
مٹاؤں کیسے خود اپنے ہی ہاتھ کا لکھا

○

اک میں ہی سرنگوں تو نہ پسپائیوں میں تھا
وہ مہرِ نیم روز بھی پرچھائیوں میں تھا

اوپر جمی ہوئی تھیں تہیں ریمیات کی
پانی تعلقات کا گہرائیوں میں تھا

یہ کس کے سوگ میں تھے کھلے سر چھتوں پہ لوگ
ماتم یہ کس کی موت کا انگنائیوں میں تھا

وہ سنگ باریوں سے بچاتا بھی کیا مجھے
غیروں کے ساتھ وہ بھی تماشائیوں میں تھا

جتنی ہی تیز جھوٹ کے ہونٹوں پہ تھی مٹھاس
اُتنا ہی تلخ زہر بھی سچّائیوں میں تھا

اُس دشت میں تھا اندھا کنواں ہی مرا نصیب
کچھ فرق دشمنوں نہ سگے بھائیوں میں تھا

وہ لاکھ اُبھر کے بھی تو رہا دُوسروں کا عکس
میں ڈوب کر بھی اپنی ہی پرچھائیوں میں تھا

پنہاں تھی غم کی لہر سی موجِ نشاط میں
ہلکا سا سوزِ درد بھی شہنائیوں میں تھا

پھر بھی نہ جانے ہو گیا دشمن زمانہ کیوں
میں تو برائیوں میں نہ اچھّائیوں میں تھا

محسنؔ وہ زہر پھیل گیا سطح پر بھی اب
کل تک جو صرف ذہن کی گہرائیوں میں تھا

○

ایسا نہیں کہ اور ستمگر نہ آئیں گے
لیکن تمہارے قد کے برابر نہ آئیں گے

ہم آئیں گے تو ہو کے رہِ مستقیم سے
اوروں کی طرح بھول بھٹک کر نہ آئیں گے

اِس بار کھو دیا تو ملیں گے نہ پھر تمہیں
اَب کے جو ہم گئے تو پلٹ کر نہ آئیں گے

مِل جُل کے آؤ بخش دیں اِن لمحوں کو دوام
یہ لمحے زندگی میں مکرّر نہ آئیں گے

کیا یہ لہو کا دَور مِرے سر پہ ختم ہے
کیا دُوسروں کے سر پہ یہ خنجر نہ آئیں گے

ہم نے بھی کوئی گُل تو نہ پھینکے تھے اُس طرف
پتّھر کے کیا جواب میں پتھّر نہ آئیں گے

چہرے ستم گروں کے تو کیا ہوں گے بے نقاب
اُن کے تو نام بھی سرِ محضر نہ آئیں گے

آئیں گے ہم بناتے ہوئے اپنے نقشِ پا
چل کر کسی کے نقشِ قدم پر نہ آئیں گے

محسن یہ دَور ختم سمجھئے اب اِس کے بعد
گردش میں یہ پیالہ و ساغر نہ آئیں گے

○

اُس کا کوئی نہ قد نہ سراپا بلند ہے
تقدیر کا بس اُس کی ستارا بلند ہے

قاتل کے ہاتھ میں جو یہ نیزا بلند ہے
اِس سے وہ سر بہت ہی زیادا بلند ہے

دفتر میں خواہ عہدہ کچھ اُس کا بلند ہے
باہر تو خاکسار کا رُتبا بلند ہے

صحرا میں تشنگی کا تو شکوہ ہے اور بات
کیوں شورِ العطش لبِ دریا بلند ہے

رتبہ میں کوئی کم تو نہیں ذرّہ زمیں
کہنے کو آسمان کا پایا بلند ہے

نکلے کہاں ہو بیٹھ کے کاغذ کی ناؤ میں
چاروں طرف تو آگ کا دریا بلند ہے

یہ بزمِ دوستاں ہے چلے آؤ بے جھجک
کوئی یہاں نہ پست نہ ایسا بلند ہے

دوشِ ہوا پہ سوچ سمجھ کر سوار ہو
اب کے اِن آندھیوں کا نشانا بلند ہے

سوزِ دروں سے جل گیا سب کچھ لکھا ہوا
ہر ایک موئے حرف سے شعلا بلند ہے

دریا جہاں رواں ہے اُسی کے نشیب میں
اب تک کسی جَری کا پھریرا بلند ہے

محسنؔ کوئی سوار نمودار بھی تو ہو
کب سے غبارِ دامنِ صحرا بلند ہے

باغ سارا تو بیاباں نہ ہوا تھا سو ہوا
جو خزاں کا کبھی احساں نہ ہوا تھا سو ہوا

ہم تو بیدار ہوئے خواب سے اپنے لیکن
وہ بھی خوابوں میں پریشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

ہم بھی کچھ سوچ کے کر بیٹھے بالآخر شکوہ
وہ بھی پہلے تو پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

مشعلیں سر کی سجائی گئیں طشتِ زر میں
کب سے مقتل میں چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا

سفرِ جاں کی ہوئی اب کہیں جا کر تکمیل
یعنی مَیں بے سروساماں نہ ہوا تھا سو ہوا

دیکھتے دیکھتے آ پہنچا سروں تک پانی
اب تک اندازۂ طوفاں نہ ہوا تھا سو ہوا

دوستوں میں جو تعلّق تھا وہ باقی نہ رہا
دشمنوں میں کوئی پیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

اور کیا مجھ کو صلہ ملتا خلوصِ دل کا
ہدفِ تہمتِ یاراں نہ ہوا تھا سو ہوا

دشت میں ابر تو برسا وہ دو اک بوند سہی
پہلے اتنا بھی تو امکاں نہ ہوا تھا سو ہوا

محسنؔ اچھّا ہی ہوا اُس نے اُلٹ دی جو نقاب
رنگ اُس کا جو نمایاں نہ ہوا تھا سو ہوا

○

وہ موت کا منظر تھا جو دن رات، وہی ہے
منہ سے نہ کہو صورتِ حالات وہی ہے

لفظوں کے اُلٹ پھیر سے بدلے گا نہ مطلب
اِمداد جسے کہتے ہیں خیرات وہی ہے

شب خون کی نیت سے در آئی ہے دوبارا
غفلت میں نہ آجاؤ کہ یہ رات وہی ہے

گُل کرنا چراغوں کا تو اک کھیل ہے اُس کا
واضح ہے پسِ پردۂ ظلمات وہی ہے

طے ہم نے بھی کر رکھا ہے مانگیں گے نہ اُس سے
یہ سچ ہے اگر قبلۂ حاجات وہی ہے

زنجیریں موسم کی ہیں جکڑے ہوئے دن رات
سردی وہی گرمی وہی برسات وہی ہے

ہم نے تو اِسی طرح گذارے ہیں شب و روز
اپنے لئے ہر دن وہی ہر رات وہی ہے

اک بار ملے تھے کسی تقریب میں اُس سے
تھوڑی سی بس اک اُس سے ملاقات وہی ہے

ہے کِتنا مُشابہ تری تصویر سے کوئی
صورت وہی جامہ وہی ہر بات وہی ہے

کچھ میرے ہی مانند ہے طرزِ سُخن اُس کا
اندازِ اشارات و کنایات وہی ہے

دونوں ہی طرف آگ برابر کی ہے محسنؔ
دونوں ہی طرف گرمیٔ جذبات وہی ہے

○

اپنے ہی نہیں غیر طرفدار ہیں اُس کے
وہ یار سبھی کا ہے سبھی یار ہیں اُس کے

کچھ لوگ ہیں ایسے بھی جو حق بات کہیں گے
ایسا تو نہیں سب ہی نمک خوار ہیں اُس کے

وہ بھاؤ بدل سکتا ہے بس ایک نظر سے
ساری ہی دُکانیں سبھی بازار ہیں اُس کے

اُس نے ہی تو اس راہ کو دشوار بنایا
رستے میں بچھائے ہوئے یہ خار ہیں اُس کے

لگتا ہے یہیں پر تھا کہیں شہرِ تمنّا
ہر چند نشانات نہ آثار ہیں اُس کے

محسنؔ جو ملے جنسِ ہُنر ہم کو بتاؤ
کوئی نہ سہی ہم تو خریدار ہیں اُس کے

○

غم نہیں دیدۂ تر دے کے گیا
وہ مجھے کشتِ گہر دے کے گیا

شاخ کو شاخ سے جوڑا اُس نے
پیڑ کو برگ و ثمر دے کے گیا

شب گزیدہ وہ رہا خود لیکن
میری راتوں کو سحر دے کے گیا

نفع سب بانٹ گیا غیروں میں
خود کو کیا کیا وہ ضرر دے کے گیا

لا کے اک حدِّ گماں تک مجھ کو
نئے امکاں کی خبر دے کے گیا

حرفِ اظہار بنا ہونٹوں پر
گُونگے لفظوں کو اثر دے کے گیا

وہ بھی آتا نہیں اب مجھ کو نظر
اِتنی اُونچی وہ نظر دے کے گیا

اب کہاں مَیں اُسے ڈھونڈوں محسنؔ
کچھ نشانی نہ خبر دے کے گیا

○

اُمید کوئی نہیں آسرا بھی کوئی نہیں
دوا بھی کوئی نہیں اب دعا بھی کوئی نہیں

کچھ اتنے ہو گئے بیزار اپنے حال سے لوگ
کہ اپنے حال پہ اب سوچتا بھی کوئی نہیں

بتائے کون وہاں کیا گزر گئی کس پر
کہ اُس دیار سے آیا گیا بھی کوئی نہیں

حصارِ جاں کے وہ اُس پار ہی تو رہتا ہے
فقط ہے شرطِ سفر فاصلہ بھی کوئی نہیں

گزر ہوا جو کبھی اُس سے مل لئے ورنہ
سوال اُس سے کجُا مدّعا بھی کوئی نہیں

مرے سُخن نے مجھے روشناس سب سے کیا
دگرنہ چہرے سے پہچانتا بھی کوئی نہیں

ہمیں نے خود پہ کیئے بند سارے در محسنؔ
نکلنا چاہیں تو اب راستا بھی کوئی نہیں

اِس رہ گذر سے آئیں کہ اُس رہ گذر سے آئیں
منزل تو سب کی ایک ہے چاہے جدھر سے آئیں

یہ ظلم دیکھئے کہ گھروں میں لگی ہے آگ
اور حکم ہے مکین نکل کر نہ گھر سے آئیں

احباب کیوں تلاش کریں اور کوئی در
اُن کے لئے تو وا ہے یہ دل وہ اِدھر سے آئیں

تم سے ملیں تو کیسے کہ دشمن ہے تاک میں
کس طرح بچ کے حلقۂ دامِ نظر سے آئیں

ہم تو کھڑے ہوئے ہیں اُسی طرح سر بلند
اب جس قدر بھی سنگِ ملامت اُدھر سے آئیں

آنے میں پاس شاید اُنہیں یہ حجاب ہو
کیوں کر وہ درمیانِ ہجومِ نظر سے آئیں

یہ جھوٹ اگر نہیں ہے کہ در اور بھی ہیں وا
پھر کیا ضرور ہے کہ سبھی ایک در سے آئیں

محسنؔ نکل سکیں گے نہ وہ اِس حصار سے
چاہے جدھر سے جائیں وہ چاہے جدھر سے آئیں

○

وہ سانحہ ہوا ہے کہ کچھ بھی کہا نہ جائے
کوئی بیاں کرے بھی تو مجھ سے سُنا نہ جائے

عزّت کی بھیک اُس درِ ذلّت سے مانگئے
میرا تو کیا سوال ہے میری بلا نہ جائے

وہ یوں تو لائے گا نہ کسی کو نگاہ میں
جب تک کہ آئینہ اُسے کوئی دکھا نہ جائے

جانے کو جا رہا ہے ہر اک سمت راستہ
جانا مجھے جدھر ہے اُدھر راستا نہ جائے

خود کو چھپا رہا ہے جو میری نگاہ سے
مجھ کو بھی وہ نگاہ سے میری چھپا نہ جائے

پیچھے کی سمت کون قدم کھینچنے لگا
منزل بہت قریب ہے پھر بھی بڑھا نہ جائے

یہ زندگی تو بن گئی اک پیرِ تسمہ پا
یہ بار اب کسی کے حوالے کیا نہ جائے

یہ کیا ضرور اُس کا پتا پوچھتا پھروں
آکر وہ آپ اپنا پتا کیوں بتا نہ جائے

یوں لگ چکی ہے لوگوں کے منہ جھوٹ کی مٹھاس
سچائیوں کا گھونٹ کسی سے پیا نہ جائے

محسنؔ مری زبان قلم ہو تو ہو مگر
قاتل کو مجھ سے عیسیِ دوراں کہا نہ جائے

○

کون اُس تیغِ ستم گر سے بچا
جو بچا اپنے مقدّر سے بچا

صاف انکار ہی بہتر ہے کہ میں
زحمتِ عرضِ مکرّر سے بچا

لے نہ ڈوبیں مری موجیں مجھ کو
آ مجھے میرے سمندر سے بچا

جس کو آئینہ بنانا ہو تجھے
ایسے پتھّر کو مرے سر سے بچا

راستہ میں مجھے منزل نہ ملی
یہ بھی اچھّا ہوا ٹھوکر سے بچا

آشیاں شاخ ہوا پر اُس کا
میرے ٹوٹے ہوئے شہ پر سے بچا

محبسِ ذات سے باہر لے چل
مجھ کو اِس گنبدِ بے در سے بچا

میں جو محسنؔ ہوں مجروح تو کیا
وہ بھی کب وقت کے خنجر سے بچا

ہو یا نہ ہو طلوعِ سحر تم کو اس سے کیا
کر لیں گے ہم یہ شب بھی بسر تم کو اس سے کیا

اِس معرکہ سے تم نے تو دامن بچا لیا
ہم بھی جو آ رہیں جاں کا خطر تم کو اس سے کیا

رستے میں روز ہوتے ہی رہتے ہیں حادثے
لوٹے نہ کوئی شام کو گھر تم کو اس سے کیا

نزدیک ہی تو دیدہ و دل کے رہو گے تم
ہے کتنی دُور کا یہ سفر تم کو اِس سے کیا

آجائے گا مکین کوئی شہرِ دل میں اور
ہم ہو گئے جو شہر بدر تم کو اس سے کیا

تم کو نیا مکان، نیا شہر راس آئے
یہ جو اُجڑ گیا ہے نگر تم کو اس سے کیا

صحرا اگر کسی کو سمندر دکھائی دے
تم تو نہیں ہو آئینہ گر تم کو اس سے کیا

محسنؔ صدا لگا کے دعا کر کے بڑھ چلو
وا ہو کہ ہو نہیں ہے بابِ اثر تم کو اس سے کیا

○

ہونے سے پاش پاش بچا لے گیا اُسے
اچھا ہوا کہ خواب اُڑا لے گیا اُسے

تنکے کی سطحِ آب پہ یوں بھی تھی کیا بساط
سیلاب اپنے ساتھ بہا لے گیا اُسے

میری تمام عُمر کا اندوختہ جو تھا
جھپکی پلک تو کوئی چُرا لے گیا اُسے

وہ سر پہ سائباں نہ تھا ٹکڑا تھا ابر کا
جھونکا ہی اک ہوا کا اُڑا لے گیا اُسے

اُس کے بیانِ حق میں جو پہلو ریا کا تھا
وہ گفتگو کے فن سے نبھا لے گیا اُسے

محسنؔ مرے خدا نے تو بخشا مجھے عُروج
کن پستیوں میں اُس کا خدا لے گیا اُسے

○

ہر چند یہ حق ہیں مرے اچھّا نہیں ہوگا
ذلّت کا مگر مجھ سے یہ سودا نہیں ہوگا

تصویر کا رُخ تو ہے بہت مختلف اُس سے
تم نے اُسے اچھّی طرح دیکھا نہیں ہوگا

سنّاٹا سا ہے شام سے کیوں مقتلِ شب میں
کیا آج کی شب کوئی تماشا نہیں ہوگا

یہ رنگِ جنوں کیوں نہ رہے گا کہ مرے بعد
دیوانے نہیں ہوں گے کہ صحرا نہیں ہوگا

پلکوں میں سجا لیں گے ہم اشکوں کے ستارے
بُجھنے سے چراغوں کے اندھیرا نہیں ہوگا

ہاتھوں میں ذرا تول کے تلوار اُٹھا نا
دشمن بھی کوئی موم کا پُتلا نہیں ہوگا

ناگاہ تو اِس دشت میں آئے نہ تھے محسن
معلوم تھا سر پر کہیں سایا نہیں ہوگا

○

"ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک"
جیتا ہے کون آمدِ فصلِ بہار تک

بڑھ کر اُٹھا لو اَب بھی جو اوراقِ گُل ملیں
جلدی کرو کہ پھر نہ ملے گا غبار تک

یہ سوچ لو لہو کا سمندر رہے درمیاں
اِس دشتِ بے شجر سے گُلوں کے دیار تک

اے چشمِ ناز پھر بھی ترا شکریہ بہت
تیرے کرم کے ہم نہ تھے امیدوار تک

دل کا زیاں نہیں ہے جو مطلوب ہے یہاں
رکھیئے تعلقات کو بس کاروبار تک

کیا جانے صحنِ باغ میں کیسی ہوا چلی
اب کے کسی شجر پہ نہیں برگ و بار تک

گرتے تھے برگِ گل بھی کبھی اب یہ حال ہے
چبھتی نہیں ہے دل میں کوئی نوکِ خار تک

محسنؔ چلو یہاں سے کہ وہ اب نہ آئے گا
کرتے ہیں انتظار حدِ انتظار تک

○

مُسلّط پھر سے ہو جائے اندھیرا یہ نہیں ہوگا
بُجھا دے پھر کوئی شمعِ تمنّا یہ نہیں ہوگا

یہ کس رستے پہ آ نکلے کہ منزل ہو گئی اوجھل
کسی سے پُوچھ لیں منزل کا رستا یہ نہیں ہوگا

ہمارے سامنے تصویرِ قاتل پھر رہی رہتی ہے
کھُلی آنکھوں سے ہم کھا جائیں دھوکا یہ نہیں ہوگا

اب اِس ترکِ تعلّق کو مقدّر ہی سمجھ لیجے
ہمیں تسلیم ہے اُس کا بھی منشا، یہ نہیں ہوگا

نہ شورِ نعرہ ہائے ہو، نہ زنجیروں کی جھنکاریں
ہمیں شک ہے جنوں والوں کا صحرا یہ نہیں ہوگا

جو دیکھا تو ہر اک منظر وہی دیکھا ہوا نکلا
یہی سُنتے رہے اب کے تماشا یہ نہیں ہوگا

کواکب اصل میں کیا ہیں ہمیں معلوم ہے محسنؔ
یہ بازی گر ہمیں دے جائیں دھوکا یہ نہیں ہوگا

○

ہندو سے کہوں گا نہ مسلماں سے کہوں گا
انساں پہ جو گذری ہے وہ انساں سے کہوں گا

دیکھا ہے ہر اک گُل کو لہو رنگ قبا میں
یہ خوابِ پریشاں نہ بہاراں سے کہوں گا

باندھوں گا نئے ڈھنگ سے مضمونِ وفا اب
پھر قصّۂ دل اک نئے عنواں سے کہوں گا

کیوں چھوڑ کہاں آئے تم آنکھوں کی بصارت
پوچھے گی تو کیا شامِ چراغاں سے کہوں گا

آجائے اگر جی میں برس جائے یہاں بھی
میں خود تو نہ کچھ ابرِ گریزاں سے کہوں گا

مجھ سے تو نہ اٹھ پائے گا یہ بارِ ندامت
کشتی کی حفاظت کو نہ طوفاں سے کہوں گا

تا حدِّ نظر بجھتے چراغوں کا دُھواں ہے
رُوداد سحر شامِ غریباں سے کہوں گا

اب ٹُوٹے ہوئے دل کو میں بہلاؤں گا کیونکر
سمجھانے کو کیا دیدۂ گریاں سے کہوں گا

دیوار پہ تحریر بہت صاف لکھی ہے
منہ سے نہ میں کچھ خسروِ دوراں سے کہوں گا

زخمی جو ہیں اب ہاتھ گریباں بھی ہیں صد چاک
اب تو ہوں جُدا دست و گریباں سے کہوں گا

ٹکرا کے سر آواز پلٹ آئے گی محسنؔ
چلاّ کے بھی کیا شہرِ خموشاں سے کہوں گا

○

جس کی خاطر میں ہوا بیمار وہ کب آئے گا
آ چکے میرے سبھی غم خوار وہ کب آئے گا

ایک مدت ہو گئی تقدیر کو سوتے ہوئے
بن کے میرا طالعِ بیدار وہ کب آئے گا

آئینے چہروں کے آویزاں ہوئے بازار میں
دیکھنے یہ رونقِ بازار وہ کب آئے گا

دوست تو بن کر عدو مدِ مقابل آ چکے
مجھ سے ہونے برسرِ پیکار وہ کب آئے گا

آؤ بے پتوار ہی طوفاں کی جانب بڑھ چلیں
کیا پتا لے کر کوئی پتوار وہ کب آئے گا

اِن سرابوں میں ہے محسن کس کا تم کو انتظار
وہ تو رہتا ہے سمندر پار وہ کب آئے گا

○

صبا پھر لے کے اُس کا نام آئی
وہی پھر فصلِ خوں آشام آئی

نئے یارانے تھے دو چار دن کے
پُرانی دوستی ہی کام آئی

اندھیروں کے طویل اس سلسلے میں
چلو اک شامِ خوش انجام آئی

گیا کس رہ گذر سے ہو کے سورج
یہ کس رستے سے چھُپ کر شام آئی

ق

نہ دل کے ٹوٹنے کی کوئی آہٹ
نہ آوازِ شکستِ جام آئی

تھا چاروں سمت آوازوں کا جنگل
نوا سنجی نہ کچھ بھی کام آئی

عجب غربت کا عالم تھا کہ محسنؔ
وطن کی یاد اِک اِک گام آئی

جب ٹیس تھی زخموں میں اشکوں میں روانی تھی
دل پر نہ تھا بارِ اتنا ایسی نہ گرانی تھی

رات اپنی طبیعت میں کچھ ایسی روانی تھی
پتھریلی زمیں کو بھی چھُو دیتے تو پانی تھی

معدوم ہوئے جب ہم رہتا وہ نمایاں کیا
پہچان جو تھی اپنی اُس کی بھی نشانی تھی

معلوم نہ ہو پایا کیا بیت گئی اُس پر
شیشے کی کہانی تو پتھر کی زبانی تھی

اظہارِ معانی کو درکار نہ تھے دفتر
جتنی سی حقیقت تھی اُتنی سی کہانی تھی

دل ملتا بھی کیا اُس سے جب بُعد تھا ذہنوں میں
بس اُس سے تعلّق کی اک رسم نبھانی تھی

محسن تھی نمائش سب اُوپر سے نئے پن کی
گوشے میں تو ہر دل کے تصویر پرانی تھی

○

دکھا رہی ہے جہاں دھوپ اب اثر اپنا
بکھیرتا تھا وہیں سایہ اک شجر اپنا

پھلوں کا اب کے بھی پہلے سے ہو گیا سودا
درخت چھو نہ سکیں گے کوئی ثمر اپنا

بہت ہی تیز تھا خنجر ہوا کے ہاتھوں میں
بچا سکا کوئی طائر نہ بال و پر اپنا

کبھی جو سامنے آیا تو چھپ گیا ہوں کبھی
یہ ایک کھیل رہا خود سے عمر بھر اپنا

ابھی تو باقی ہیں منزل کی ٹھوکریں کچھ اور
یہیں پہ ختم نہیں ہے ابھی سفر اپنا

یہ کون شمع لئے پیش پیش چلتا رہا
دکھائی بھی نہ دیا کون تھا خضر اپنا

ق

نظامِ جبر کی وہ کر رہا ہے پھر توسیع
بڑھا رہا ہے وہ پھر حلقۂ اثر اپنا

کوئی نہیں ہے جو شمشیر چھین لے اُس سے
چھُپائے پھرتا ہے ہر ایک شخص سر اپنا

کسی پہ کھُلتا بھی کیا اپنا کربِ غم محسنؔ
نہ کوئی مرثیہ خواں تھا نہ نوحہ گر اپنا

○

آئینہ میں اب کچھ ہے نہ آئینہ گری میں
ہر شخص گرفتار ہوا کم نظری میں

اب کیوں ہے تمہیں شکوۂ بیداد کسی سے
تم خود بھی تو کچھ کم نہ تھے بیداد گری میں

گھر کے درو دیوار بھی شمشیر بکف ہیں
ہے جاں کی اماں اب تو فقط دربدری میں

اِس پردۂ زرتار میں ہے کون سا معشوق
ہم اتنی خبر رکھتے ہیں اِس بے خبری میں

یہ رات ڈھلے گی تو بَلا سر سے ٹلے گی
اِک عمر رہے ہم اِسی خوابِ سحری میں

دشمن کو بھی ہم نے کبھی دشمن نہیں سمجھا
ہم جاں سے گئے اپنی وسیع النظری میں

صد چاک ہوا جس کے سبب اپنا گریباں
کیا کیجے کہ ماہر ہے وہی بخیہ گری میں

ق

انسان کی صُورت میں تھا وہ ایک فرشتہ
اک نور کا پیکر تھا لباسِ بشری میں

اَسرارِ مشیّت کے سبھی اُس پہ عیاں تھے
اُس کا کوئی ہمسر نہ ہوا دیدہ وری میں

محسنؔ ہے یہ کیوں مُجھ سے شغف اہلِ ہنر کو
کیا بات نظر آئی مری بے ہُنری میں

○

گِلہ نہیں کہ مخالف مرا زمانہ ہوا
میں خود ہی چھوڑ کے کارِ جہاں روانہ ہوا

مَیں اب چلا کہ مرا قافلہ روانہ ہوا
کبھی پھر آؤں گا واپس جو آب و دانہ ہوا

مَیں بالمشافہ نہیں جانتا کسی کو یہاں
کہ مجھ سے میرا تعارف بھی غائبانہ ہوا

ہوائے گُل بھی نہ پیروں کی بن سکی زنجیر
بہار میں بھی نہ اب کے کوئی دِوانہ ہوا

جو ریگ زیرِ قدم آئی بن گئی سبزہ
غبارِ سر پہ جو آیا تو شامیانہ ہوا

کسی کو نوکِ سناں بھی ضمیر کی نہ چُبھی
کسی کو ایک اشارہ ہی تازیانہ ہوا

زمانہ کھنچ کے نہ کیوں اُس کے پاس جائے گا
وہ عالی جاہ ہوا صاحبِ خزانہ ہوا

برس رہی ہے مری چشمِ نم تو برسوں سے
تہی نہ ابرِ گہُر بار کا خزانہ ہوا

نظر میں شب کا یہ منظر سمیٹ لو محسن
سحر قریب ہے اب ختم یہ فسانہ ہوا

جانے کدھر کا رُخ تھا وہ کس قافلے میں تھا
وہ ایک راہ رو جو ابھی راستے میں تھا

ہاں انتظارِ شوق نہ آنا تھا آج اُنہیں
مجھ کو یقین کب تھا میں خود وسوسے میں تھا

اِک اِک پہ وہ نگاہ دمِ آخریں نہ پوچھ
منظر عجیب کرب کا بُجھتے دیے میں تھا

گزرا تھا جس سے ہو کے بہاروں کا قافلہ
اک دشتِ بے گیاہ اُسی راستے میں تھا

موسم کے ساتھ اُس نے بھی چولا بدل لیا
میں بھی عجیب شخص ہوں کس واہمے میں تھا

دل سے مٹا کے دیکھ لیا اُس کا نقش بھی
لیکن وہ بار بار اِسی آئینے میں تھا

حیران ہوں کہ کیسے ستارے بدل گئے
لکھّا ہوا تو اور ہی کچھ زائچے میں تھا

محسنؔ یہیں پہ ختم ہے ماضی کی داستاں
سب لکھ چکا ہوں جو بھی مرے حافظے میں تھا

ممنوع ہے یاں تذکرۂ غم نہیں ہوتا
اس شہرِ یزیداں میں مُحرّم نہیں ہوتا

ہر سوچی ہوئی بات مکمل نہیں ہوتی
ہر دیکھا ہوا خواب مجسّم نہیں ہوتا

پہلے تو قلم دیدۂ پُرنم کی طرح تھا
اب لکھئے تو اک حرفِ ورق نم نہیں ہوتا

جب تک کہ کوئی شخص نہ احساس دلائے
اب اپنے کسی غم کا مجھے غم نہیں ہوتا

رہتا تھا مرے دل میں کبھی درد مسلسل
اب اتنا افاقہ ہے کہ پیہم نہیں ہوتا

اُس وقت تک آئینے میں روشن ہے یہ چہرہ
جب تک کسی انبوہ میں مدغم نہیں ہوتا

گھر چھوڑ کے نکلے ہو عبث تم تن تنہا
ہر شخص تو گھر چھوڑ کے گوتم نہیں ہوتا

رہ رہ کے گرا کرتے ہیں خستہ در و دیوار
مسمار محل کوئی بھی یک دم نہیں ہوتا

کس راہ سے پہنچا کوئی منزل پہ یہ دیکھو
منزل پہ پہنچنا ہی مقدم نہیں ہوتا

محسن ہے یہ سرمایۂ دل ایسا اثاثہ
جتنا بھی کرو صرف کبھی کم نہیں ہوتا

○

کوئی بے وجہ کیوں خفا ہوگا
کچھ تو اُس کو بُرا لگا ہوگا

آگے جا کر ٹھہر گیا ہوگا
وہ مری راہ تک رہا ہوگا

چھوڑ آئے تھے ہم جلا کے جسے
وہ دِیا کب کا بُجھ گیا ہوگا

جب وہ آواز تھم گئی ہوگی
شب کا سنّاٹا بولتا ہوگا

کیسے معلوم ہو کہ آخرِ وقت
اُس نے کیا کچھ کہا سُنا ہو گا

کیوں ہَوا تیز ابھی سے چلنے لگی
غنچۂ غم ابھی کِھلا ہو گا

لہجہ اُس کا بھی کچھ تھا اپنا سا
وہ بھی اپنے دیار کا ہو گا

پہلا سجدہ جہاں کیا تھا وہیں
آخری سجدہ بھی ادا ہو گا

ہو نہ ہو منزل آ گئی محسنؔ
چند قدموں کا فاصلا ہو گا

○

سیلابِ سنگ و آتش و خوں سے گذر کے مَیں
آیا ہوں اپنے پیشِ نظر پھر سنور کے مَیں

اب جا کے اُس پہاڑ کی اونچائی ناپ لو
آیا ہوں جس پہاڑ سے نیچے اُتر کے مَیں

یہ اور بات مل نہ سکی منزلِ مُراد
پھیرے لگا چکا ہوں ہر اک رہ گذر کے مَیں

اُس کو مٹا سکے گا نہ موجِ ہوا کا ہاتھ
پانی پہ جا رہا ہوں جو تحریر کر کے مَیں

اب دُھوپ پر کروں نہ قناعت تو کیا کروں
پتے گرا چکا ہوں سبھی اس شجر کے مَیں

اے خاکِ شہر تو مجھے بیشک سمیٹ لے
آیا ہوں کتنا ٹوٹ کے کتنا بکھر کے مَیں

چہروں کے اژدہام میں ڈھونڈوں بھی کس طرح
اُس کو تو دیکھ بھی نہ سکا آنکھ بھر کے مَیں

آنکھوں سے ہو گئے وہ مناظر بہت ہی دُور
اِتنا قریب آ گیا اپنی نظر کے مَیں

اِک روز محسنؔ اُس سے بچھڑنا ضرور تھا
بیٹھا ہوا تھا پہلے ہی افسوس کر کے مَیں

○

ہو میرے خدا مجھ کو عطا اِس سے زیادہ
پھیلے گا نہ دامانِ گدا اِس سے زیادہ

کل تک یہیں رہتا تھا وہ اطراف میں دل کے
معلوم نہیں اُس کا پتا اِس سے زیادہ

جانے نہ دو اِس دشت سے آگے اِسے ورنہ
پھیلے گی مِری گردِ نوا اِس سے زیادہ

جب ہو گا خود احساس چھپا لے گا وہ چہرہ
آئینہ دکھائیں اُسے کیا اِس سے زیادہ

ہوتا ہے زمانہ میں ہر اک شخص کا اک نام
اپنی کوئی پہچان بتا اِس سے زیادہ

کچھ بھولے ہوئے شعر ہیں اب اپنا اثاثہ
لے دے کے نہ کچھ پاس بچا اِس سے زیادہ

محسن یہ جو اَب دیکھنے سُننے کو ملا ہے
پہلے کبھی دیکھا نہ سُنا اِس سے زیادہ

○

ہر چند اُسے خود بھی ہم اچھا نہیں کہتے
تم جتنا برا کہتے ہو اُتنا نہیں کہتے

ہے ڈُوبنے والوں کو تو کشتی کی ضرورت
تنکے کے سہارے کو سہارا نہیں کہتے

ہم اور بھلا غیروں سے دُکھ اپنا کہیں گے
اپنوں سے بھی جب حال ہم اپنا نہیں کہتے

ہم حرفِ طلب لاتے نہیں لب پہ مُکرّر
اِک بار جو کہتے ہیں دوبارا نہیں کہتے

ہے معرکۂ کرب و بلا اصل میں دنیا
بازیچۂ اطفال کو دنیا نہیں کہتے

مقصود تو شکوہ ہے ملامت نہیں اُس کی
لو چپ ہوئے جاتے ہیں زیادا نہیں کہتے

گُستاخ زبانی کی سزا شوق سے دیجے
ڈرتے تو سرِ عام ہم ایسا نہیں کہتے

تم ساتھ ہوا کرتے ہو ہنگامِ سخن بھی
ہم شعر بھی کہتے ہیں تو تنہا نہیں کہتے

آنکھوں سے جو دیکھا ہے بیاں کرتے ہیں محسن
ہم کوئی کہانی کوئی قصا نہیں کہتے

○

خواہشِ تخت و تاج اور ہے کچھ
لیکن اپنا مزاج اور ہے کچھ

کیا بھروسا بدلتے موسم کا
رنگ کل کچھ تھا آج اور ہے کچھ

پاس داری یہاں نہیں چلتی
اِس نگر کا رواج اور ہے کچھ

خوش نہ ہو ہم جو ہو گئے خاموش
صورتِ احتجاج اور ہے کچھ

کام چلتا نہیں ہے مرہم سے
زخمِ دل کا علاج اور ہے کچھ

سوچنا اور اُداس ہو جانا
حال ہی دل کا آج اور ہے کچھ

اک زمانہ تھا ہم مزاج تھے ہم
اب تو اُس کا مزاج اور ہے کچھ

شعر کہنا ہے ایک فن محسن
دفتری کام کاج اور ہے کچھ

○

یاں کوئی شاخِ وفا پھولنے پھلنے سے رہی
شہرِ کوفہ کی روایت تو بدلنے سے رہی

میں ہوں اور وادیِ غربت کا سفر ہے پیہم
اب کوئی روکے مِری راہ بدلنے سے رہی

مختصر یہ کہ اسی طرح جھُلستے رہیے
ابر آنے سے رہا دھوپ بھی ڈھلنے سے رہی

کیسۂ زر سے سبھی بولتے منہ بند ہوئے
اب کسی منہ سے بھی حق بات نکلنے سے رہی

یہ بلا جائے گی نذرانہ سروں کا لے کر
کسی جادو کسی منتر سے تو ٹلنے سے رہی

کسی تدبیر سے گرماؤ دلوں کو ورنہ
درمیاں برف جو حائل ہے پگھلنے سے رہی

وہ زمیں بوئے گئے دشنہ و خنجر جس میں
وہ کوئی لعل و جواہر تو اُگلنے سے رہی

محسنؔ اُس کو میں بہت جانتا پہچانتا ہوں
اُس کے بارے میں مری رائے بدلنے سے رہی

○

اُن کی مدد کو اُن کے طرفدار آئیں گے
لیکن کہاں سے اپنے مددگار آئیں گے

جنسِ ہُنر کا ڈھیر لگا تو دیا مگر
اِس جنس کے نہ کوئی خریدار آئیں گے

پھنس کر بھنور میں ڈوب چکی ہو گی اپنی ناؤ
جب تک کہیں سے مانگ کے پتوار آئیں گے

آیا ہے یہ پیام دُکانیں کھلی رہیں
وہ جلد لے کے گرمیٔ بازار آئیں گے

جب تک یہ سر جُدا نہیں ہوتا اماں نہیں
اِس سر کے ورنہ روز طلب گار آئیں گے

تم میں سے جو بھی چاہے مرا ساتھ چھوڑ دے
دیکھو یہاں سے راستے دشوار آئیں گے

محسؔن یہ شہرِ دل ہے بھُلایا نہ جائے گا
خوابوں میں بھی یہی درو دیوار آئیں گے

○

آسماں اپنی بلندی سے گرا کیا اب کے سال
بن گئے کتنے ہی ذرّے عرش پیما اب کے سال

دیکھئے وہ کیا دکھاتا ہے تماشا اب کے سال
اُس کے تن پر اور ہی کوئی ہے چہرا اب کے سال

ہو گا وصلِ دوست یا خونِ تمنّا اب کے سال
فیصلہ کُن موڑ پر ہے دل کا قصّا اب کے سال

اب نہ اگلی سی ملاقاتیں نہ اب وہ چاہتیں
دوستوں کا ہے عجب ہی کچھ رویّا اب کے سال

بھیڑ تو لوگوں کی ہے لیکن کوئی چہرہ نہیں
آئینہ تکتا ہے خود اپنا ہی چہرا اب کے سال

صاحبِ افسر تھے جو محسنؔ ابھی پچھلے برس
سر برہنہ پھر رہے ہیں ہو کے رُسوا اب کے سال

○

کبھی تو ڈال منظر اپنے بام و در پر بھی
کھلے ہوئے ہیں کئی پھول تجھ سے باہر بھی

وہ آس پاس مرے دل کے اب بھی رہتا ہے
نواحِ جاں سے کہاں جا سکا بچھڑ کر بھی

عجیب موجِ شرر بار لمس لمس میں تھی
کہ جل رہے تھے بدن پانیوں کے اندر بھی

تری نگاہ نے اپنی سی کر کے دیکھ تو لی
اُتر سکے نہ رگِ سنگ میں یہ نشتر بھی

بہا کے لے گیا سچّائیوں کو جھوٹ کے ساتھ
کہ اُس کے پاس تھے طبل و علم بھی لشکر بھی

ذرا سی دیر کو پتھر کا بُت ہمیں بھی بنا
جگا دے لمس کا جادُو ذرا سا ہم پر بھی

تمام سبزے ہی سبزے کی رَو نہیں محسنؔ
کہیں کہیں تو لہو رنگ ہے یہ منظر بھی

○

ظلم ایک جیسا سب پہ روا ہونے والا ہے
وہ اب تو ہم سبھی کا خُدا ہونے والا ہے

آنکھوں میں جذب کر لو یہ منظر کہ اِس کے بعد
آئینہ آب عکس ہوا ہونے والا ہے

نکلے گا اور ہی کوئی چہرہ نقاب سے
ہنگامہ دُوسرا ہی بپا ہونے والا ہے

پہنچے مجھے عدو سے ضرر یا تجھے ضرر
تیرا نہ اِس سے میرا بھلا ہونے والا ہے

اِس طرح ٹوٹ کر تو نہ پہلے ملا تھا وہ
لگتا ہے اب وہ مجھ سے جُدا ہونے والا ہے

ہوگا ادا جو ہوگی کبھی زندگی تمام
یہ قرضِ جاں کب آج ادا ہونے والا ہے

چاروں طرف ہے ایک پُراسرار خامُشی
کوئی بھی جانتا نہیں کیا ہونے والا ہے

چُپ اور رہ سکے گی نہ محسنؔ مری زباں
بس تیر اَب کماں سے جُدا ہونے والا ہے

یہ تو نہیں کہ اپنا مقدّر ہی ایسا تھا
آشوب روزگار کا سر پر ہی ایسا تھا

رستہ بدل کے بھی تو وہی ٹھوکریں ملیں
حائل ہماری راہ میں پتھر ہی ایسا تھا

مشکل سے کوئی پھول بچا ہو گا باغ میں
اب کے ہوا کے ہاتھ میں خنجر ہی ایسا تھا

جو دائرہ بنا وہ بکھرتا چلا گیا
مرکز ہی اس طرح کا تھا محور ہی ایسا تھا

ٹکرا رہے تھے اپنا سر ایک دُوسرے سے لوگ
برپا ہر ایک ذہن میں محشر ہی ایسا تھا

ہم کب کے رو چکے ہیں سفینے کے حال پر
ساحل سے مدّ و جزر کا منظر ہی ایسا تھا

اپنے لہو سے گُل جو کھلاتا چلا گیا
اِس دشتِ بے شجر میں وہ لشکر ہی ایسا تھا

ہر خواہش ایک جال سا بُنتی چلی گئی
جاتے کہاں حِصار سے چکّر ہی ایسا تھا

اُس شخص سے نُمو کی توقع بھی تھی کسے
وہ شخص اپنی ذات سے بنجر ہی ایسا تھا

محسنؔ زمانہ میرا مخالف تو تھا مگر
میرا بھی تھا قصور میں خود سر ہی ایسا تھا

○

کر گئے پامال گئی غم کی ہوا کیا کیا کچھ
ورنہ سرسبز تھی اِس دل کی فضا کیا کیا کچھ

پاس تو اُس کے نہ تھا مال و متاعِ دنیا
پھر بھی وہ میرے لیے چھوڑ گیا کیا کیا کچھ

جانے برباد ہوئے ہوں گے مسافر کتنے
راہ میں بکھرے ہیں نقشِ کفِ پا کیا کیا کچھ

منہ سے کہتا نہیں کچھ، بس یہی مجبوری ہے
دیکھتا میں بھی ہوں تصویر بنا کیا کیا کچھ

کچھ بھی منزل پہ پہنچنے کے سوا یاد نہیں
لُٹ گیا راہ میں کیا پاس بچا کیا کیا کچھ

ثبت ہونٹوں پہ رہی مہرِ خموشی محسنؔ
کہہ گئی پھر بھی مری خاکِ نوا کیا کیا کچھ

○

چند لمحوں کے لئے انجمن آرائی تھی
پھر وہی میں تھا، وہی رات کی تنہائی تھی

چڑھتے سورج کی توجہ رہی ساری اُس پار
روشنی کی تو اِدھر صرف جھلک آئی تھی

اپنے دل میں بھی تھی تعمیرِ مکاں کی حسرت
اپنی قسمت میں مگر بادیہ پیمائی تھی

اپنے ہی بوجھ سے ہر ڈوبنے والا ڈوبا
ورنہ طوفان سے کشتی تو نکل آئی تھی

چل دیے بس یونہی اک سایے کے پیچھے پیچھے
نہ تعارف ہی تھا اُس سے نہ شناسائی تھی

کون اُس دشت میں کہتا مجھے محسن لبیک
اپنی ہی خاکِ نوا گونج کے لوٹ آئی تھی

○

شب کی قندیل نہ تنویرِ سحر ساتھ رہی
اپنی ہی روشنیٔ فکر و نظر ساتھ رہی

مجھ کو دیکھو کہ لڑا میں تنِ تنہا کیسے
اُس کی نصرت کو توکُل نوعِ بشر ساتھ رہی

اوّل اوّل تو بہت لوگ تھے ہمراہ مگر
آخر آخر تو بس اِک گردِ سفر ساتھ رہی

مثلِ عنقا ہی رہی آنکھ سے منزل اوجھل
لاکھ سایے کی طرح راہ گذر ساتھ رہی

دیکھنا موجِ ہوا کا بھی ملے گا نہ مزاج
اور کچھ دیر یہ آندھی کے اگر ساتھ رہی

محسن اِس سال بھی کچھ فیض بتوں سے نہ مِلا
وہی قسمت کی شکن بارِ دگر ساتھ رہی

○

کچھ پتا نامہ بر کا تھا ہی نہیں
کوئی امکاں خبر کا تھا ہی نہیں

خوب پہچانتا تھا چہرۂ شب
مجھ کو دھوکا سحر کا تھا ہی نہیں

ہر جگہ اپنے سر پہ سورج تھا
کہیں سایہ شجر کا تھا ہی نہیں

گھر میں بھی یوں تھا کچھ الگ سب سے
جیسے میں فرد گھر کا تھا ہی نہیں

بو کسی اور ہی درخت کی تھی
پھل وہ تیرے شجر کا تھا ہی نہیں

وہ بیاں راہزن کے باب میں تھا
ذکر تو راہبر کا تھا ہی نہیں

وہ عیاں تھا کہ بے نقاب جو تھا
دخل اس میں نظر کا تھا ہی نہیں

وہ تھی دراصل شخصیات کی جنگ
مسئلہ خیر و شر کا تھا ہی نہیں

جوڑتا کیا وہ دل کے ٹکڑوں کو
کام یہ شیشہ گر کا تھا ہی نہیں

کیوں رہا تا حیات صدمۂ ہجر
ساتھ جب عمر بھر کا تھا ہی نہیں

اُٹھ گئے خود بخود قدم محسن
قصد کوئی سفر کا تھا ہی نہیں

○

ہمارے روز و شب پہلے بسر ایسے نہ ہوتے تھے
ہم اپنے حالِ دل سے بے خبر ایسے نہ ہوتے تھے

جو لمحوں میں گزر جائیں سفر ایسے نہ ہوتے تھے
کہ جیسے اب ہیں رستے مختصر ایسے نہ ہوتے تھے

چلے آتے تھے طائر لَوٹ کر اپنے بسیروں میں
نکل کر گھونسلوں سے در بدر ایسے نہ ہوتے تھے

ستم اکثر ہوئے صیّاد کے ہم پر مگر اب کے
ہوئے ہم جس قدر بے بال و پر ایسے نہ ہوتے تھے

یہ کس نے آتشِ خاموش کو آکر ہوا دے دی
کبھی پہلے تو آہوں میں شرر ایسے نہ ہوتے تھے

نظر آتا ہے اپنے ناخدا ہیں وجہِ غرقابی
وگرنہ کب سمندر میں بھنور ایسے نہ ہوتے تھے

خدا جانے یہ کس نے نفرتوں کے بیج بوئے ہیں
کہ اِس مٹی سے پیدا شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمیں جتنی ہے اُن کی اب خبر پہلے نہ ہوتی تھی
وہ ہم سے اب ہیں جتنے بے خبر ایسے نہ ہوتے تھے

گزر جاتے تھے برسوں سر کو ٹکراتے ہوئے محسن
کہ پتھر جیسی دیواروں میں در ایسے نہ ہوتے تھے

ڈھونڈنے نکلے تو ہر لے کے چراغ آندھی میں
خاکِ دل کا کہیں ملتا ہے سُراغ آندھی میں

نہ کہیں سبزہ بچا ہے نہ کہیں کوئی شجر
پائمال اب کے کچھ ایسا ہوا باغ آندھی میں

بادباں پر نہ بھروسا کرو کشتی والو
کہیں ملتا ہے ہواؤں کا دماغ آندھی میں

شاخ پر اب کسی طائر کا بسیرا نہ رہا
سبھی گردش میں ہیں بلبل ہو کہ زاغ آندھی میں

قتل کو آتا تھا ہر سال جو آندھی پہ سوار
مل گیا اب کے ہمیں اس کا سراغ آندھی میں

ایک زنجیر تھی پاؤں میں نشیمن کیا تھا
مل گیا روز کی بندش سے فراغ آندھی میں

سرِ میخانہ بہت دیکھے ہیں طوفاں ہم نے
لے کے بیٹھے ہیں کوئی آج ایاغ آندھی میں

کس کو آئیگا یہاں کُشتہ چراغوں کا خیال
کون دیکھے گا بھلا دل کے یہ داغ آندھی میں

جس کو بھی چاہے ہوا ساتھ اڑا لے جائے
ٹھہر پایا نہ کوئی کوہ نہ راغ آندھی میں

بادِ صرصر سے ہوا کب نہ تصادم محسنؔ
ہم نے ہر بار جلایا ہے چراغ آندھی میں

○

وہ تھے آندھی کی طرح آکے گزرنے والے
اب قدم آئے ہیں میداں میں ٹھہرنے والے

اُنہیں ڈھونڈو کہ کبھی سنگِ نشاں تھے جو لوگ
ہم تو ذرّے تھے سرِ راہ بکھرنے والے

جاکے اُس پار ہوئے کتنے مسافر غرقاب
بس ہمیں چند ہیں اب گھاٹ اُترنے والے

سستا اتنا بھی نہ اس گردِ تعلّق کو سمجھ
ہم ہیں اِس راہ سے کب روز گزرنے والے

اور اُونچی نہ بڑھا اپنی اُڑانیں ہُشیار
تاک میں ہیں پرِ پرواز کترنے والے

دستِ تدبیر سے بن سکتی ہے قسمت تو مگر
کچھ مقدّر بھی تو ہوتے ہیں سنورنے والے

ہم وہ دیوانے ہیں محسنؔ کہ جو پھر جائے نظر
دُوسری بار کبھی رُخ نہیں کرنے والے

پہلے اپنے سحر سے ہم سب کو اندھا کر دیا
پھر سیاہِ شب نے ہم پر کھُل کے حملا کر دیا

ڈالیوں پر پتّیاں بھی ایسے موسم میں نہیں
ہم نے بھی کس رُت میں پھولوں کا تقاضا کر دیا

ذات کے محور سے کٹ کر وہ اکیلا رہ گیا
اُس کی بزم آرائیوں نے اُس کو تنہا کر دیا

ڈر رہا ہوں راس اب شاید نہ آئے اُس کا ساتھ
جب سے اُس نے التفات اپنا زیادا کر دیا

جُھک کے ان نظروں نے خاکِ دل سے جانے کیا کہا
پستیوں کو جیسے ہمدوشِ ثریّا کر دیا

ایک طائرِ دشتِ جاں کے پاس ہی اُڑتا رہا
سر پہ جب بھی دُھوپ آئی اُس نے سایا کر دیا

دُور تک پھیلی ہوئی تھی چاہتوں کی چاندنی
نفرتوں کی گرد نے یہ فرش میلا کر دیا

شوق نے محسنؔ بڑھا دی دوریٔ منزل کچھ اور
جستجو نے راستے کو اور لمبا کر دیا

○

رخشندہ سرِ خاک ستارے نظر آئے
مہتاب بھی کچھ دیر میں شاید اُتر آئے

ہم کو تو گزرنا پڑا اک دشتِ بلا سے
درپیش تمہیں کاش نہ ایسا سفر آئے

لکھی تھی مقدر ہی میں کچھ دشت نوردی
ہم گھر سے جو نکلے تو پلٹ کر نہ گھر آئے

مجھ کو نہ ملے، گرہو جواب اس کا نہیں ہیں
میرے لئے جو بد ہو نہ ایسی خبر آئے

خاموش سمندر میں یہ طوفان سا کیا ہے
ٹھہرے ہوئے پانی میں کہاں سے بھنور آئے

احساس یہاں ہوگا کسے سایۂ گُل میں
اک آگ کا دریا تھا جو ہم پار کر آئے

صد شُکر! مری پشت پہ آئی نہ کوئی ضرب
جو زخم بھی آئے وہ مرے سینے پر آئے

ہم سب ہی سمندر میں اُترنے کو کھڑے ہیں
لیکن جو گئے پار کچھ ان کی خبر آئے

اچھّا تو خوش آئے تمہیں یہ صبحِ مسرّت
مجھ کو یہ دعا دو کہ شبِ غم بسر آئے

محسنؔ ملی اس شہر میں بس خانہ بدوشی
جس شہر میں ہم چھوڑ کر اپنا نگر آئے

جب زمانہ مجھ پہ کچھ نامہرباں ایسا نہ تھا
دوست کیا دشمن بھی کوئی بدگماں ایسا نہ تھا

یہ تو سچ ہے مجھ کو اُس سے کچھ توقع تھی ضرور
اُس کی جانب سے مگر میں خوش گماں ایسا نہ تھا

سر میں اِک سودا تھا جس نے مجھ کو رکھا اُس سے دُور
فاصلہ ورنہ ہمارے درمیاں ایسا نہ تھا

مصلحت ہو گی خموشی کا سبب ورنہ وہاں
سب زباں رکھتے تھے کوئی بے زباں ایسا نہ تھا

اِس دھوئیں سے تو یہ لگتا ہے کہ شمعیں بجھ گئیں
جب ہوئیں تھیں شمعیں روشن تب دھواں ایسا نہ تھا

مجھ کو پہچانا گیا میرے لہو کی آگ سے
میں تو کوئی صاحبِ نام و نشاں ایسا نہ تھا

ہو گئے محسنؔ ہم اپنے واسطے خود سدِّ راہ
ورنہ رستہ میں کوئی سنگِ گراں ایسا نہ تھا

○

اپنا کیا رُوپ اُسے آیا نظر آئینے میں
اُس نے دیکھا بھی نہ بارِ دگر آئینے میں

قافلے چہروں کے کیا جانے ہوئے کب رخصت
رہ گئی بس یہی گردِ سفر آئینے میں

سنگریزوں کی جو صورت میں ہے اب بکھرا ہوا
پہلے ہوتا تھا یہ سارا نگر آئینے میں

اُن پہ کیا گذرے گی آئینہ اگر ٹوٹ گیا
جو رہا کرتے ہیں شام و سحر آئینے میں

ایک ہی چاند ہے اور ایک ہی سورج لیکن
جلوہ گر کتنے ہیں شمس و قمر آئینے میں

نقشِ موہوم سمجھ کر وہ مٹاتے جائیں
نظر آتا ہی رہوں گا میں ہر آئینے میں

سنگ باری کا جو تھا اتنا ہی خدشہ محسنؔ
کیوں کیا آپ نے تعمیر گھر آئینے میں

○

کیا تعلق کیسا رِشتا میرے اُس کے درمیاں
ریت کا ہے اک گھروندا میرے اُس کے درمیاں

ایک صحرا آئینہ آنکھوں میں چمکاتا ہوا
ایک دریا لہر کھاتا میرے اُس کے درمیاں

سلسلہ خیر و خبر کا نامہ بر کے دم سے تھا
اب نہیں وہ بھی وسیلا میرے اُس کے درمیاں

نیم وا آنکھوں میں جیسے جلتے بجھتے سے چراغ
کچھ اندھیرا کچھ اُجالا میرے اُس کے درمیاں

جنگ پانی کے لیے دریا بہ دریا آج بھی
معرکہ صحرا بہ صحرا میرے اُس کے درمیاں

منحصر ہے میرے سر پر اُس کے خنجر پر نہیں
یہ سر و خنجر کا رِشتا میرے اُس کے درمیاں

شمع اِک جلتی ہوئی دو پتھروں کے بیچ میں
اور روشن ایک کتبا میرے اُس کے درمیاں

قُرب کے باوصف بھی محسن رہا میں اُس سے دُور
طے شدہ اک فاصلا تھا میرے اُس کے درمیاں

○

جادُو مری زبان کا چلتا دکھائی دے
باتوں سے میری اب وہ پگھلتا دکھائی دے

دو چار گام ہی تک اندھیرا ہے راستہ
کچھ دُور پر چراغ سا جلتا دکھائی دے

کرنیں بھی اب زمیں سے اُٹھانے لگیں بساط
سورج بھی اپنے اوج سے ڈھلتا دکھائی دے

پرچھائیوں کے شہر میں لوگوں کو اپنا قد
اک دُوسرے کے قد سے نکلتا دکھائی دے

رنگوں کا وہ اسیر نہیں اُس کے جسم پر
خود ہی لباس رنگ بدلتا دکھائی دے

اب کشتیوں کو بھی تو روانی کا حکم ہو
پانی تو موج موج اُچھلتا دکھائی دے

کرنے دو آج اُس کو قلم روشنی کا سر
دیکھو وہ کل جو ہاتھ نہ ملتا دکھائی دے

وہ جب سنبھل گیا تھا تو رُخ تھا ہوا کا اور
اب جو گرا تو پھر نہ سنبھلتا دکھائی دے

محسنؔ پہنچ کے اندھے سِرے پر نہ ہو اُداس
اِک راستہ یہیں سے نکلتا دکھائی دے

○

وہ جو زخم دل میں تھا بھر گیا وہ جو یاد تھی وہ بسر گئی
میں بیاں کروں بھی تو کس طرح شبِ غم جو مجھ پہ گزر گئی

وہ جو خواب تھی ذہن میں تھی جو عکس عکس نگاہ میں
وہی شکل آنکھ میں کھب گئی وہی شکل دل میں اُتر گئی

وہی پھر ہے دشت چہار سُو وہی خار زار لہو لہو
وہ تھی ایک موجِ ہوائے گُل جو ادھر سے آئی اُدھر گئی

میں قصوروار سہی مگر یہ کہاں کی ٹھہری ہے منصفی
وہ خطا جو تھی کسی اور کی وہ خطا بھی میرے ہی سر گئی

ہے شکست و فتح نصیب سے مجھے ہار جانے کا غم نہیں
میں عذابِ جاں سے تو بچ گیا مری عاقبت تو سنور گئی

کبھی ہو کے نہرِ فرات سے کبھی شہرِ کوفہ و شام سے
وہ جو ایک موج لہو کی تھی وہ کہاں کہاں سے گزر گئی

کسی بارگاہِ نیاز میں گئی خالی ہاتھ نہ زندگی
کبھی لے کے نقدِ ہنر گئی کبھی لے کے ہدیۂ سر گئی

وہ جو راز مجھ پہ ہوا عیاں وہ ہوا کسی پہ نہ منکشف
جہاں محسنؔ اپنی نظر گئی وہاں کب کسی کی نظر گئی

○

دُور رہ کر بھی یہ قربت کبھی پہلے تو نہ تھی
ہجر میں اب جو ہے لذّت کبھی پہلے تو نہ تھی

کیا کریں اپنے بھی جب درپئے جاں ہو جائیں
ورنہ اپنوں سے شکایت کبھی پہلے تو نہ تھی

کتنے شفّاف نہ تھے آئینے دل کے لیکن
اس قدر گردِ کدورت کبھی پہلے تو نہ تھی

رسمِ گریہ کی بِنا ڈالی ہے گویا ہم نے
جیسے رونے کی روایت کبھی پہلے تو نہ تھی

غم بھی کوئی نہیں آنسو نکل آئے پھر بھی
زُود رنج اتنی طبیعت کبھی پہلے تو نہ تھی

مہربانی کو محبت نہیں کہتے نہ سہی
ہم پر اتنی بھی عنایت کبھی پہلے تو نہ تھی

ایک سی تو نہ کبھی صورتِ حالات رہی
لیکن اب جیسی ہے صورت کبھی پہلے تو نہ تھی

نام اِس دشت کا پیاسوں کے لہو سے چمکا
اِس بیاباں کو یہ شہرت کبھی پہلے تو نہ تھی

اپنے بندوں کے رویّے پہ ہیں آقا ششدر
اِن غلاموں میں یہ جرأت کبھی پہلے تو نہ تھی

شہر کا شہر تہی اپنے مکینوں سے ہوا
جانبِ دشت یہ ہجرت کبھی پہلے تو نہ تھی

دوستوں کا یہ رویّہ نہ کبھی تھا محسنؔ
دشمنوں کی یہ حمایت کبھی پہلے تو نہ تھی

○

میں ہی رُکا نہ وقت کی رفتار دیکھ کر
کہتا رہا وہ مجھ سے خبردار دیکھ کر

ہم اپنے درمیاں سے نہ پردہ اٹھا سکے
حائل خود اپنے جسم کی دیوار دیکھ کر

پھر زغۂ عدو میں کسی اجنبی کو میں
حیران ہوں معین مددگار دیکھ کر

یوں پڑھ کے اُس نے ایک طرف رکھ دیا مجھے
جس طرح پھینک دے کوئی اخبار دیکھ کر

آئے تو پاس خواب کے جھونکے کئی مگر
واپس چلے گئے مجھے بیدار دیکھ کر

یاد آ گئیں وہ سبز قبائیں لہو میں تر
جی ڈر گیا ہرے بھرے اشجار دیکھ کر

پہلے سے ہو گیا تھا بدلتی ہوا کے ساتھ
موسم سمجھ گیا تھا وہ آثار دیکھ کر

وہ بھیڑ تھی کہ خود سے بچھڑ کر نہ مل سکا
آیا ہوں سارے کوچہ و بازار دیکھ کر

یہ مت سمجھ کہ تجھ سے گلہ کچھ نہیں مجھے
میرے لبوں کو تشنۂ اظہار دیکھ کر

آئینۂ نگاہ میں تھا آبلوں کا رقص
ہر سمت اُس کا عکسِ شرربار دیکھ کر

محسنؔ وہ سیلِ نُور تو اندھا ہی کر گیا
دیکھا گیا نہ پھر اُسے اِک بار دیکھ کر

○

گو کہ دُھندلے ہیں نقوشِ در و دیوار بہت
یہ عمارت ہے مگر اب بھی خوش آثار بہت

آپ جس حال میں جس رنگ میں ہیں خوش رہیے
سوچیے گا تو زمانہ میں ہیں آزار بہت

دیکھیے کہتی ہے اب اُس کی خموشی کیا کچھ
ہو چکا لفظوں کی صورت میں تو اظہار بہت

تم کسی طرح نہ مانے چلے آئے ہمراہ
ہم نہ کہتے تھے کہ یہ راہ ہے دُشوار بہت

آج پھر کر گیا باتوں سے وہ اپنی سیراب
ایک مدت سے تھے ہم تشنۂ گفتار بہت

چند ہی شکلیں ہوئیں منعکس آئینے میں
یوں تو چہرے تھے پسِ پردۂ زنگار بہت

کنکروں میں کسے ملتا ہے نگینہ لیکن
تھا بلند اخترِ اقبالِ خریدار بہت

آخرش بیٹھ گیا اپنا سا وہ منہ لے کر
تاکتا پھرتا رہا روزنِ دیوار بہت

چوبِ خشک اس کو نہ جانو کہ یہ ہے شاخِ سخن
یہ تو بے برگ بھی رہتی ہے ثمر بار بہت

اپنے اشعار دکاں پر نہ سجاؤ محسن
دیکھو ہو جاؤ گے رسوا سرِ بازار بہت